گھاس میں تتلیاں

وزیر آغا

مکتبہ فکر و خیال ◎ لاہور

ضابطہ

حقوق	بحق مصنّف محفوظ
طبع	اوّل
ناشر	بذلِ ندیم
تعداد	ایک ہزار
خطّاطی	محمد صدیق گلزار
سرورق	مُوجد
مطبع	مکتبہ جدید پریس لاہور
ماہ وسالِ اشاعت	جولائی ۱۹۸۵ء
قیمت	تیس ۳۰ روپے

"مکتبہ فکروخیال ۲۷۱-ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور"

میراجی کے نام

گرتے پربت کو ہتھیلی پہ کوئی روکے تو شاید روکے
بہتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

(میراجی)

مصنّف کی دُوسری شعری کتابیں

شام اور سائے	(نظمیں)
دن کا زرد پہاڑ	(نظمیں اور غزلیں)
غزلیں	(غزلیں)
نردبان	(نظمیں)
آدھی صدی کے بعد	(طویل نظم)

ترتیب

غزلیں

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا ۱۱
کس نے کہا کہ غیب سے پیغام آئیں گے ۱۳
بے زباں کلیوں کا دل میلا کیا ۱۵
مرجانے کو تیار وہ ہر آن نہیں ہے ۱۷
اِس لبادے کو تار تار کریں ۱۹
اگر تارا سحر کا جل بجھا ہے ۲۱
کواڑ بجتے تھے اور دل میرا لرزتا تھا ۲۳
گنجِ دل تک تو بے نشاں پہنچے ۲۵
اُس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اُس کے ۲۷
قطرہ قطرہ تیری پلکوں سے اُترتا چاہوں ۲۹
ذہنِ رسا کی گرہیں مگر کھولنے لگے ۳۱
وُہ رنگِ دگر ہی جائے گا ۳۳
لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو ۳۵
وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا ۳۷
صبا خمار تھی موسم شراب ایسا تھا ۳۹
صبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے ۴۱
ہے تمنّا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں ۴۳
سفید پھول ملے شاخِ سیم بر کے مجھے ۴۵
کارگر اس مرتبہ بھی یہ دوا ہو جائے گی ۴۷
خراب و خستہ و بدحال و بے بصر جانا ۴۹
کہو صبا سے کہ میرے قریب آئے نہیں ۵۱
کہا یہ کس نے کہ پھولوں سے دل لگاؤں میں ۵۳
آنکھ بے پردہ تھی اُس کی ہونٹ بے زنجیر تھا ۵۵
خوشبو کے کتنے رنگ ہیں موجِ ہوا سے پوچھ ۵۷

کیا خبر تھی سُو بہ سُو جائے گا تُو ۵۹
شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں ۶۱
پھُول رُت آئی تو بے نام تھا بے ننگ تھا وہ ۶۳
یہ کیا کہ تیز ہَوا سے تو سلسلہ رکھنا ۶۵
دل بضد ہے کہ گنگنائیں تجھے ۶۷

نظمیں

شام ۷۱
کون اُس کو روک سکتا ہے؟ ۷۳
درانتی رقص کرتی ہے! ۷۶
ساون کا آخری دن! ۷۸
مجھے خزاں نے بہت ڈرایا! ۸۱
جزیرے ۸۳
آزادی! ۸۶
بارش کے بعد ۸۹
بیوگی ۹۱
تماشہ ۹۴
وُہ اِک آبی پرندہ ۹۶
سنجوگ ۹۷
صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے ۹۹
سانپ پر پاؤں آجانے کے بعد ۱۰۱
دستک ۱۰۳
مجھ دیکھا ۱۰۴
پوسٹ مارٹم ۱۰۶

طویل نظمیں

ٹرمینس ۱۱۱
الاؤ ۱۲۴
اندر کے رونے کی آواز ۱۳۱

پیش لفظ

ایک اور انیک کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ بعض لوگ انگنت چہروں میں صرف ایک چہرے کے نقوش تلاش کرتے ہیں اور اگر مقدر یاوری کرے تو اپنی سعی میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر بعض لوگ ایک چہرے میں انیک چہروں کے خدوخال دیکھ لیتے ہیں۔ اور یوں ساری زندگی عالمِ حیرت میں بسر کرتے ہیں۔ تخلیق کار اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مگر تخلیق کار بھی کئی طرح کے ہیں۔ بعض سورج کی طرح روشنی کا ایک بہت بڑا منبع ہوتے ہیں۔ وہ دانش کی شعاعوں کو چہار اکناف میں پھیلاتے پڑ فادر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی انہیں ننگی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ اگر دیکھے تو بینائی سے محروم ہو جائے ——— بعض تخلیق کار چاند کی طرح، بھیگی ہوئی روشنی پھیلاتے ہیں۔ یہ روشنی اندھیرے سے متصادم نہیں ہوتی بلکہ اس میں حل ہو کر چاندنی کا رُوپ دھار لیتی ہے اور ہزاروں لاکھوں کہانیوں کو جنم دے ڈالتی ہے۔ ان کے علاوہ بعض تخلیق کار ایسے بھی ہیں جو زندگی بھر موم بتی کی طرح نُور کے ایک مختصر سے دائرے کے اندر ہی سُلگتے رہتے ہیں۔ شاعر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

سو شعر کہنا موم بتّی کی طرح دھیرے دھیرے سُلگنے کا عمل ہے۔ مگر موم بتّی کی روشنی سُورج کی شعاع کی طرح خطِ مُستقیم پر سفر نہیں کرتی۔ بلکہ ایک شمع کی نوک سے چھلانگ لگا کر دوسری اور پھر تیسری تک پہنچتی ہے اور تب یہ جلتی ہوئی شمعیں دائرہ در دائرہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے پھر غروب ہو جاتا ہے۔ چاند اُبھرتا ہے پھر ڈوب جاتا ہے مگر یہ ننھی منّی سی شمعیں سدا سلگتی رہتی ہیں۔ شاعری کا حلقۂ اثر اسی لیے زیادہ ہے کہ شاعری نور کے دائرے تخلیق کرتی ہے اور پھر ان دائروں کے اندر تا قیامت سُلگنے کا اہتمام کرتی ہے۔

میری کہانی یہ ہے کہ مَیں نے تنقیدی کتب بھی لکھی ہیں، لاتعداد موضوعات پر مقالے بھی سپردِ قلم کیے ہیں اور بقول شخصے انشائیوں کے ڈھیر بھی لگائے ہیں مگر ان کے علاوہ مَیں نے ایک ننھّی سی موم بتّی بھی سلگائی ہے اور یہ موم بتّی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے کہ اس کا تعلق میرے شعری باطن سے بہت گہرا ہے۔ اس موم بتّی کی نوک پر جو روشنی اُگی ہے اُس نے باہر کی طرف تو ایک دائرہ نُور بنایا ہے جو دیکھنے والوں کو نظر آ سکتا ہے مگر اس کے نُور کا اصل دائرہ وُہ ہے جو شاعر کی ذات کے اندر نمودار ہُوا ہے اور جس نے اُسے سیاحتِ قلب کا شیریں ذائقہ عطا کیا ہے۔ اگر اس عمل سے کچھ اور موم بتیاں گھاس پر رقص کرتی ہُوئی تتلیوں کی طرح لَو دینے لگیں۔ تو میرے لیے یہ سعادت ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ میرے لیے یہی بہت ہے کہ روشنی کے اس دائرے میں قلعہ بند ہو کر مَیں نے اپنے اندر کی سیاحت تو کی ہے۔ اور اس سیاحت میں وہ کچھ حاصل کیا ہے جو باہر کی دُنیا میں سفر کرنے والے کسی بھی مارکو پولو یا کولمبس کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے میری شاعری کے ایک نقّاد نے (جو اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں) اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ مَیں عمر بھر شاعری سے کیوں چمٹا رہا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو مَیں اُنہیں بتاتا کہ شاعری نے میرے اندر روشنی پھیلائی ہے اور اگر مجھے شعر کہنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو مَیں کسی بھی صنفِ ادب میں کچھ نہ کر سکتا۔ شاعری میرے لیے رُوح کی غذا ہے اور مَیں نے اسکی فراہم کردہ قوّت سے خود کو زندہ رکھا ہے۔ رہی یہ بات کہ خود اس شاعری میں زندہ رہنے کی سکت کس قدر ہے تو اس کے لیے پہلے عصر کو عبُور کرنا شاید ضروری قرار پائے۔ سو مَیں راضی برضا ہوں۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ مَیں نے آج سے چالیس برس پہلے جو موم بتّی جلائی تھی وہ ابھی تک ہولے ہولے سُلگ رہی ہے۔

وزیر آغا

غزلیں

آنسو، ستارے، اوس کے دانے، سفید پھول
سب میرے غم گسار سرِ شام آئیں گے

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

سحر کی اوس سے کہنا کہ ایک پل تو رُکے
کہ ناپسند ہے ہم کو بھی خاک پر رہنا

تمام عمر ہی گزُری ہے دستکیں سُنتے
ہمیں تو راس نہ آیا خود اپنے گھر رہنا

وُہ خوش کلام ہے ایسا کہ اُس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

سفر عزیز ہَوا کو مگر عزیز ہمیں
مثالِ نکہتِ گُل اُس کا ہم سفر رہنا

شجر پہ پھُول تو آتے رہے بہُت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا اُس کا بے ثمر رہنا

عجیب طرزِ تکلّم ہے اُس کی آنکھوں کا
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا

ورق ورق نہ سہی عمرِ رائیگاں میری
ہَوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا

ذرا سی ٹھیس لگی اور گھر کو اوڑھ لیا
کہاں گیا وہ تمہارا نگر نگر رہنا

کس نے کہا کہ غیب سے پیغام آئیں گے؟
تارے بلک بلک کے سرِ عام آئیں گے

سوچا نہ تھا کہ ابرِ سیہ پوش سے کبھی
کوندے ترے بدن کے مرے نام آئیں گے

اُس نخلِ نامراد سے، جو پات جھڑ گئے
اندھی خنک ہواؤں کے اب کام آئیں گے

آنسُو، ستارے، اوس کے دانے، سفید پھُول
سب میرے غم گُسار سرِ شام آئیں گے

تھی کیا خبر کہ روئیں گے دیوار و دَر ہمیں
لاکھوں سندیسے ہم کو بہر گام آئیں گے

رکھ ان کو تُو بچا کے کسی اور کے لیے
یہ قول یہ قرار ترے کام آئیں گے

لَوٹے اگر سفر سے کبھی ہم تو ڈر نہیں
صورت بدل کے آئیں گے بے نام آئیں گے

بے زباں کلیوں کا دل میلا کیا
اے ہوائے صُبح، تُو نے کیا کیا

کی عطا ہر گُل کو اِک رنگیں قبا
بُوئے گُل کو شہر میں رُسوا کیا

کیا تجھے وہ صُبحِ کاذب یاد ہے
روشنی سے تُو نے جب پردہ کیا؟

بے خیالی میں ستارے چُن لیے
جگمگاتی رات کو اندھا کیا

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی
اِک ستارہ دیر تک رویا کیا

رُوٹھ کر گھر سے گیا تُو کتنی بار
کیا در و دیوار نے پیچھا کیا ؟

ایک خوابِ بیکراں تھا اور مَیں
تُو نے، لفظِ بے صدا، یہ کیا کیا!

اپنی عُریانی چُھپانے کے لیے
تُو نے سارے شہر کو ننگا کیا

مرجانے کو تیار وہ ہر آن نہیں ہے
نادان سہی اتنا بھی نادان نہیں ہے

شیریںیٔ گفتار نہیں گر میری پہچان
خوشبوئے بدن تیری بھی پہچان نہیں ہے

ناواقفِ خوں گشتۂ سحر میں بھی نہیں ہوں
انجان مگر تُو بھی مری جان نہیں ہے

کچھ دیکھ لیا ہو گا مری آنکھ میں ورنہ
بے وجہ ترے لب پہ یہ مُسکان نہیں ہے

آ صورتِ شبنم ہی کبھی میری طرف تُو
سُورج کے نکلنے کا تو امکان نہیں ہے

اُن رنگ بدلتی ہُوئی آنکھوں کی ہر اک بات
آسان ہے، پر اتنی بھی آسان نہیں ہے

وُہ شخص کہ مانندِ صبا گزرا چمن سے
بے گھر سہی پر بے سر و سامان نہیں ہے

آنکھوں میں جراحت کی رمق باقی ہے ورنہ
پہلی سی وُہ اب صورتِ پیکان نہیں ہے

اک رات کبھی اپنے بدن میں بھی گزاروں
صحرائے بدن اتنا تو سنسان نہیں ہے

اِس لبادے کو تار تار کریں
اک نیا چہرہ اختیار کریں

سیکھ لیں چاندنی سے عیّاری
اور کرنوں کا کاروبار کریں

رات بھر نفرتوں کی شال بُنیں
صُبح دم ہر کسی سے پیار کریں

پھُول پھینکیں کہ تیر برسائیں
جی میں جو آئے میرے یار کریں

دل کہ ہے راستے کا اِک پتّھر
آؤ اس کوہِ غم کو پار کریں

رات بھر کہکشاں کی مالا میں
دانہ دانہ تجھے شمار کریں

لب لرزتے ہیں آنکھ پُرنم ہے
اور کیا تیرے غم گُسار کریں؟

اگر تارا سحر کا جل بجُھا ہے
یہ آنسو سا تری پلکوں پہ کیا ہے؟

درختوں کو تو چُپ ہونا تھا اک دن
پرندوں کو مگر کیا ہو گیا ہے!

زمیں پر صُورتیں ہی صُورتیں ہیں
فلک پر آنسوؤں کا سلسلہ ہے

سحر کیوں آتے آتے رُک گئی ہے
کہاں وُہ صُبح کا تارا گیا ہے؟

مِری ہر سانس میں خوشبُو ہے اُس کی
کہوں کیسے کہ وُہ مجھ سے جُدا ہے

دھنک دیوار ہے رستے میں حائل
وگرنہ جَست بھر کا فاصلہ ہے

اُسے بند آنکھ سے مَیں دیکھ تو لُوں
مگر پھر عمر بھر کا رَتجگا ہے

اگر صحرا ہوں مَیں صحرانشیں تُو
صدا دینے کا پھر کیا فائدہ ہے؟

بُہت روکا اُسے پر نہ رُکا وُہ
کبھی جھونکا ہَوا کا بھی رُکا ہے

کواڑ بجتے تھے اور دل مِرا لرزتا تھا
مَیں برگِ سبز تھا لیکن ہَوا سے ڈرتا تھا

تمام راہوں میں بکھرے پڑے ہیں اس کے قدم
زمیں کی دُھول سے وُہ کتنا پیار کرتا تھا

مَیں اُس کا کچھ بھی نہیں تھا تو پھر دمِ رخصت
پلٹ پلٹ کے مجھے کس لیے وُہ تکتا تھا

بدن میں اُس کے فروزاں تھا کیا کہ وقتِ سحر
تمام دیپ بجھے تھے مگر وُہ جلتا تھا

بہار ایک چُبھن تھی مَیں اُس کا کیا کرتا
خزاں تو زخم تھی اور زخم دل کو لگتا تھا

وُہ ایک شخص کہ تاروں کی لَو تھا جس کا بدن
کبھی کبھی وُہ زمیں پر اُترنے لگتا تھا

ہر ایک پیڑ ہے منقار زیرِ پَر اب تو
وُہ شام کیا ہُوئی جب ہر شجر چہکتا تھا

گُنجِ دل تک تو بے نشاں پہنچے
پھر نجانے کہاں کہاں پہنچے

تشنگی کی سبیل جاری تھی
ہم مُسافر جہاں جہاں پہنچے

ایک مُدّت کے بعد ہم آخر
اپنے اور اُس کے درمیاں پہنچے

کیسے سر ہو یہ روشنی کا پہاڑ
کیسے منزل پہ خستہ جاں پہنچے

اِک پرندہ ہے یہ زمیں، دیکھیں
کس شجر پر یہ بے زباں پہنچے

لمسِ گُل بھی نہ مَیں کروں منظور
اُس کی جاں کو اگر زیاں پہنچے

دشت در دشت ہے مُسافتِ شب
کس خرابے میں کارواں پہنچے

اُس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اُس کے
وُہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پَر و بال اُس کے

زرد رُو ایک ہی پَل میں ہُوئی مدھ ماتی شام
لال ہونے بھی نہ پائے تھے ابھی گال اُس کے

کہکشاؤں میں تڑپتے تھے ستاروں کے پرند
سبز آکاش پہ ہر سُو تھے بچھے جال اُس کے

کاٹ ہی لیں گے جُدائی کا زمانہ ہم تو
دیکھئے کیسے گزرتے ہیں مہ و سال اُس کے

ایک دن ہم بھی کھلے اُس کی حسیں راہوں میں
ایک دن قدموں میں ہم بھی ہُوئے پامال اُس کے

چاندنی اُس کا بدن، چاند ہے اُس کا چہرہ
دھان کی کھیتیاں، آنکھوں کے حسیں تال اُس کے

رتجگا ہم بھی منائیں کہ سُنا ہے ہم نے
روز لکھتی ہے سحر، خُون سے احوال اُس کے

قطرہ قطرہ تیری پلکوں سے اُترنا چاہوں
ہو سکے مجھ سے تو یہ کام بھی کرنا چاہوں

زہر لفظوں کا تو رِستا ہے شگافِ لب سے
اور مَیں چہرے کے اِس زخم کو بھرنا چاہوں

سُوکھتے پیڑ کی شاخوں سے رہائی مانگوں
خشک پتّا ہوں زمیں پر مَیں اُترنا چاہوں

دن چڑھے وعدوں کی خوشبو میں بسالوں خود کو
شام آئے تو مَیں ہر شے سے مُکرنا چاہوں

موت کو دیکھ کے جینے کی دُعائیں مانگوں
زندگی پاؤں پڑے اور مَیں مرنا چاہوں

مَیں دبے پاؤں نِرے سوئے ہُوئے آنگن سے
صُبح کی پہلی کرن بن کے گزرنا چاہوں

کیوں نہ رُک جاؤں تجھے دیکھ کے اے چاندنی شب!
اوس بن کر تیرے قدموں میں بکھرنا چاہوں

ذہنِ رسا کی گرہیں مگر کھولنے لگے
پھر یوں ہُوا کہ لوگ ہمیں تولنے لگے

آہستہ بات کر کہ ہَوا تیز ہے بہت
ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

عُمرِ رواں کو پار کیا تُو نے اور ہم
رسّی کے پُل پہ پاؤں رکھا ڈولنے لگے

دستک ہَوا ہی دے کہ یہ سنّاٹا ختم ہو
سُونے گھروں میں کوئی تو رَس گھولنے لگے

مَیں بن گیا گہُر تو مِرا اس میں دوش کیا
بے وجہ مجھ کو خاک میں تم رولنے لگے

وُہ برنگِ دگر ہی جائے گا
بن کے خوشبو بکھر ہی جائے گا

ایک لمحہ اگر گزُر جائے
دُوسرا تو گزر ہی جائے گا

خوگرِ تیرگی! اگر تُو نے
شمع دیکھی تو ڈر ہی جائے گا

اب خوشی بھی تو دل پہ وار کرے
غم تو یہ کام کر ہی جائے گا

مَیں مُصر ہوں کہ ہم سفر ہو مرا
وہ بضد ہے کہ گھر ہی جائے گا

قیدِ مژگاں سے کر اُسے آزاد
ورنہ آنسُو تو مر ہی جائے گا

ضبط کرتا رہا اگر یُوں ہی
یہ شجر بے ثمر ہی جائے گا

نُور میراث آنکھ والوں کی
بے بصر، بے بصر ہی جائے گا

لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو
مِیلا بدن پہن کے نہ اتنا اُداس ہو

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دُور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

اِک جوئے بے قرار ہو کیوں دلکشی تری
کیوں اتنی تشنہ لب میری آنکھوں کی پیاس ہو

پہنا دے چاندنی کو قبا اپنے جسم کی
اُس کا بدن بھی تیری طرح بے لباس ہو

رنگوں کی قتل گہ میں کبھی تُو بھی آ کے دیکھ
شاید کہ رنگِ زخم کوئی تجھ کو راس ہو

مَیں بھی نسیمِ صُبح کی صُورت، پھروں سدا
شامل گُلوں کی باس میں گر تیری باس ہو

آئے وُہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری
بنجر زمیں پہ، میلوں تلک، سبز گھاس ہو

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا
رات بھر نافۂ گل بن کے مہکنے والا

لکّۂ ابر تھا ــــ بس دیکھنے آیا تھا مجھے
کوئی بادل تو نہیں تھا وہ چھلکنے والا

راکھ میں، آنکھ میں، پھولوں پہ، کسی شب میں
بے ضرورت کبھی تو چمکا ہے چمکنے والا

کس کی آواز میں ہے ٹوٹتے پتّوں کی صدا
کون اس رُت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

چاند ہو، روز بدلتے ہو، تمہارا کیا ہے
مَیں سمندر ہوں اَبد تک نہ بہکنے والا

پی لیا؟ لَوٹ گیا؟ خُشک ہُوا؟ — کچھ تو بتا
کیا ہُوا آنکھ سے آنسُو وہ ٹپکنے والا

صبا خمار تھی موسم شراب ایسا تھا
بدن کی شاخ پہ چہرہ گلاب ایسا تھا

اِک اضطراب سا لفظوں کی کائنات میں تھا
تہِ خیال کہیں پیچ و تاب ایسا تھا

سحر تھی سادہ ورق آفتاب کا تب تھا
ظہورِ عالمِ امکاں کتاب ایسا تھا

بس ایک پل میں وُہ ٹکرا کے مجُھ سے ٹُوٹ گیا
سحر کا خواب بھی نازک حُباب ایسا تھا

تھا سطحِ آب پہ جیسے کوئی نگر آباد
چمکتا قریۂ جاں زیرِ آب ایسا تھا

سُنائی دیتی نہیں تھی مجُھے مِری آواز
تمہارے شہر میں رہنا عذاب ایسا تھا

تھی خُشک پتّوں کی آواز ہم رکاب اُس کی
کہ خود ہَوا ہی میں کچُھ اضطراب ایسا تھا؟

کھُلی جو آنکھ تو دشتِ خیال تھا ہر سُو
پھر اس کے بعد سفر سارا خواب ایسا تھا

صُبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے
رات بھر شہر مگر سارے کا سارا ناچے

تُم یہ کہتے ہو کہ پَٹ کھول کے کھڑکی چہکے
اور کجرائی نگاہوں میں اشارہ ناچے

مَیں یہ کہتا ہوں کہ آنسُو کا دیا جل اُٹھّے
اور پُرشور سمندر کا کنارا ناچے

مسکراہٹ پہ لگائی تو ہے قدغن تُو نے
تیرے ہی لب پہ اگر نورؑ کا دھارا ناچے

یہ بھی کیا شام کے بُجھتے ہُوئے آتش داں میں
راکھ کی سیج پہ تا دیر شرارا ناچے

آہوئے جاں بھی تو اس دشت کو مہکائے کبھی
ایک دن اپنا بھی یہ راج دُلارا ناچے

رقص کا سلسلۂ شام و سحر ختم ہُوا
مسندِ رقص پہ اب آخری تارا ناچے

ہے تمنّا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں
تُم مقابل رہو ہم آئینہ بردار رہیں

قافلے آئیں، اُڑے گرد، چلے جائیں کہیں
اور ہم خاک بسر، نقش بہ دیوار رہیں

ہے یہ دستور گریں سال میں پتّے اِک بار
اشک گرتے میری پلکوں سے لگاتار رہیں

جی یہ کہتا ہے کہ اک روز پہن لیں خود کو
اور پھر حشر تلک زینتِ بازار رہیں

کاش آئیں نہ ابھی نیّرِ تاباں والے
اور کچھ دیر ستاروں کے یہ گلزار رہیں

چیختے ناچتے نقطوں کی سیہ آندھی میں
آپ کیوں مُہر بہ لب صورتِ دیوار رہیں؟

بے خطا بھی تو گزارا ہے زمانہ ہم نے
اب خطاکار ہُوئے ہیں تو خطاکار رہیں!

سفید پھول ملے شاخِ سیم بر کے مجھے
خزاں کو کچھ نہ ملا بے لباس کر کے مجھے

تھی دشتِ خواب میں اک تیری جُستجو مجھ کو
کہ تجھ سے شکوے ہزاروں تھے عمر بھر کے مجھے

مَیں اپنے نام کی تختی میں تھا، شریر ہَوا
گلی میں پھینک گئی بے نشان کر کے مجھے

اب اُس نگر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ رُک جاؤ
صدائیں دیتے پھرو گے گھروں سے ڈر کے مجھے

مجھے یقیں نہ ملی تجھ کو دولتِ بیدار
تجھے یہ وہم ملے ڈھیر سیم و زر کے مجھے

کبھی گلے نہ لگایا مجھے مگر پھر بھی
طواف کرنے پڑے شہرِ بے ثمر کے مجھے

سُلا دیا جرسِ ناقۂ سحر نے اُسے
"جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے"

کارگر اس مرتبہ بھی یہ دوا ہو جائے گی
دیکھ لینا دَرد کی شدّت سوا ہو جائے گی

یوں ہی گر چلتی رہی بے آسرا بے سنگِ میل
فاصلوں کی گرد میں پاگل ہَوا ہو جائے گی

دائرے کے گُنبدِ بے دَر میں ہو جائے گی بند
اور پھر بے دست و پا تیری صدا ہو جائے گی

ایک پَل دیکھے گی تجُھ کو آشنا نظروں کے ساتھ
دُوسرے پَل بے سبب نا آشنا ہو جائے گی

کیا خبر تھی اِس قدر شدّت کا ہو گا انتظار
راستے کی ہر صَدا آوازِ پا ہو جائے گی

رات بھیگے گی تو ہر تارا چُبھن بن جائے گا
رفتہ رفتہ خُوں میں تر شب کی قبا ہو جائے گی

خراب و خستہ و بے حال و بے بصر جانا
ہَوا کو ہم نے مگر پھر بھی ہم سفر جانا

ہُوا وُہ نغمہ سرا جب تو رابطے ٹُوٹے
رہا نہ یاد کسی کو بھی اپنے گھر جانا

تھی کیا خبر کہ وُہ اِک پَل میں پَرفشاں ہو گا
وُہ جس کو ہم نے سدا مُشتِ بال و پَر جانا

وفا شعار کو دی تُم نے دُشمنوں میں جگہ
جو دُشمنوں میں تھا اُس کو عزیز تر جانا

اور اب یہ حال کہ بیٹھے ہیں رہگزر میں کہیں
خُدا ہی جانے کہ ہم کو تھا کس نگر جانا

اُسے یہ وہم کہ وُہ اِک شجر ہے سایہ دار
ہمیں ملال کہ ہم نے اُسے شجر جانا

قدم قدم پہ رُکی عمرِ رائیگاں اپنی
کہ خود کو ہم نے سَدا سنگِ رہگزر جانا

کہو صبا سے کہ میرے قریب آئے نہیں
مجھے گلاب سمجھ کر گلے لگائے نہیں

یقیں دلاؤ نہ مجھ کو تم پرائے نہیں
مجھے تو زخم لگے تم نے زخم کھائے نہیں

عجیب شخص ہو چڑیا سے روز کہتے ہو
سلگتی دھوپ میں سوکھے شجر پہ آئے نہیں

یہ آئینہ کسی اُجڑے مکاں کا آئینہ ہے
مَیں گرد صاف بھی کر دُوں تو مُسکرائے نہیں

رُکوں تو تنکے بھی اُڑنے لگیں سوئے افلاک
اُڑوں تو کوئی پرندہ بھی پَر ہلائے نہیں

مکاں خموش اگر ہے تو دوش کس کا ہے
کرے بھی کیا جو کوئی اُس کو گھر بنائے نہیں

نجانے کب سے مِرے شہر کے دَر و دیوار
بُلا رہے ہیں اُس اک شخص کو جو آئے نہیں

کہا یہ کس نے کہ پھُولوں سے دل لگاؤں مَیں
ترے خیال کو چھوڑوں تو مر نہ جاؤں مَیں

یہ ایک تُو ہے کہ چمکے ہے چاکِ اَبر میں تُو
یہ ایک مَیں ہوں کہ بارش کے تِیر کھاؤں مَیں

عجب نہیں کہ تِری آنکھ میں بھی نُور آئے
کرن سی بن کے کبھی تیرے در پہ آؤں مَیں

تمام رات چُرائے تُو اوس کے موتی
تمام رات ستاروں کے گُرز کھاؤں مَیں

مَیں کس زمین میں دفناؤں اپنی آنکھوں کو
کہاں یہ دولتِ بیدار لے کے جاؤں مَیں

اُٹھوں کہ دُھوپ تو اب آ گئی منڈیروں پر
جو گھر میں سوئے پڑے ہیں اُنہیں جگاؤں مَیں

ہے بات اتنی کہ تجھ بِن رہی نہ بات کوئی
مگر یہ بات تجھے کس طرح بتاؤں مَیں؟[1]

---

[1] نسیم شمائلپوری مرحوم کی یاد میں

آنکھ بے پردہ تھی اُس کی، ہونٹ بے زنجیر تھا
سلسلہ الفاظ کا چلتی ہُوئی شمشیر تھا

تیرگی بے آبرو تھی اور تجلّی بے وقار
اِک تھکا ہارا سا جگنو کس قدر دلگیر تھا

وُہ بھی کیا دن تھے کہ بے چہرہ پھرا کرتے تھے لوگ
آدمی جب آدمی کی ہو بہُو تصویر تھا

جُرم تھا میرا کہ مَیں نے جُرم میں شرکت نہ کی
تھی مِری تقصیر بس اتنی کہ بے تقصیر تھا

فاصلوں کی ڈور میں اُلجھی ہُوئی تھی رہگزر
رہگزر کے پیچ و خم میں قید اک راہگیر تھا

تھا سلونی جھیل کے ہاتھوں میں اک سونے کا تھال
تھال پر نوحہ ہَوا کا جا بجا تحریر تھا

بن گیا ہوتا مَیں مُشتِ خاک سے خاکِ شفا
صُبح کی پہلی کِرن کا لمس بے تاثیر تھا

دیکھتے ہی دیکھتے اُبھری فلک پر قوسِ رنگ
اور پھر چہرہ تمہارا جیسے اِک تصویر تھا

آج پتّھر کی طرح حائل ہُوں اپنی راہ میں
مَیں کہ کل تک بے نشاں تھا اور بے توقیر تھا

خوشبو کے کتنے رنگ ہیں موجِ ہوا سے پُوچھ
عارض سے پھُوٹتے ہُوئے رنگِ حنا سے پُوچھ

پھُولوں بھری رِدا کو کہاں لے گئی ہَوا
رستے کے ہر مُسافرِ خستہ قبا سے پُوچھ

اُس دشتِ بے اماں میں گئی کتنی دُور تک
کچھُ تو صدائے حلقۂ زنجیرِ پا سے پُوچھ

دھنسنے لگا ہے گرد کی دلدل میں سارا شہر
کیا ہو گیا ہے، شہر کی آب و ہَوا سے پُوچھ

اندھی مُسافتوں کا دیا اِذن کس لیے
اب پوچھنا ہے میرا پتہ تو ہَوا سے پُوچھ

چہکے پرند، حجرۂ شب بولنے لگا
آثار کیا یہی ہیں سحر کے، خدا سے پُوچھ

کیا خبر تھی سُو بہ سُو جائے گا تُو
اِک صدا بن کر بکھر جائے گا تُو

رُو برو پائے گا خود کو بار بار
چھوڑ کر خود کو کہاں جائے گا تُو

آنکھ میں آئے گا آنسو کی طرح
اوس کی صُورت چلا جائے گا تُو

مَیں صبا کے پیرہن میں آؤں گا
صورتِ خوشبُو بکھر جائے گا تُو

اِک صدا بن کر اُٹھے گا خاک سے
اور فلک کو پار کر جائے گا تُو

یا نکل کر جامۂ گُل سے فقط
باغ کی دیوار تک جائے گا تُو؟

اے تھکے ہارے مُسافر کچھ بتا
اور کتنی دُور اب جائے گا تُو

شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
پنچھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں

رات آئے تو یادوں کے سب زخم ہرے ہو جاتے ہیں
سانپوں ایسے تارے ہم کو ڈنک چبھونے لگتے ہیں

صُبح سویرے رات کے رہزن پھُول اور چاند اور تارے سب
شبنم کے چھینٹوں سے اپنے چہرے دھونے لگتے ہیں

لفظوں کی آواز سے کیوں اب خوف سا ہم کو آتا ہے
کیوں ہم کو اب مرمر ایسے بدن سلونے لگتے ہیں

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے موجوں کا سر جھک جاتا ہے
اور کشتی کو کشتی والے آپ ڈبونے لگتے ہیں

اک تم ہو جو دُکھ کو ٹھوکر مار کے آگے بڑھتے ہو
اِک ہم ہیں جو سینے میں اس دُکھ کو بلونے لگتے ہیں

پھُول رُت آئی تو بے نام تھا بے ننگ تھا وہ
اور خزاں آئی تو اک جلوۂ صد رنگ تھا وہ

ضبط کرتا تھا مگر بات نکل جاتی تھی
اپنی آواز کی لرزش سے بہت تنگ تھا وہ

کیا کہوں، کس سے کہوں، کون سُنے گا میری
اَن سُنی اُس نے بھی کی گرچہ مرے سنگ تھا وہ

آج وہ دُشمنِ جاں ہے کبھی وہ بھی دن تھے
مِری خوشبُو، میری بینائی، مرا انگ تھا وہ

وہ تھا مہکار مجسّم وہ تھا چہکار تمام
اور تُم کہتے ہو اِک نرشا ہُوا سنگ تھا وہ

یاد ہے آج بھی وُہ ساعتِ نمناک مجھے
مَیں تھا آنسو کی طرح چشمِ سیہ رنگ تھا وہ

وُہ کہ اب عالمِ حیرت سے ہے محرُوم، کبھی
دیکھ کر پھُول کی پتّی کو ہُوا دنگ تھا وہ

مجھ سے بچھڑا تو ہُوا اُس کو نہ پھر چین نصیب
کبھی فرسنگ، کبھی کتبۂ فرسنگ تھا وہ

یہ کیا کہ تیز ہَوا سے تو سلسلہ رکھنا
ہَوا میں اُڑتے پَروں کا نہ کچھ پتا رکھنا

نکل پڑے ہو سفر کو تو شاہراہ کے ساتھ
کسی کی یاد کے کتبے جگہ جگہ رکھنا

پگھلتی شام سے کہنا نہ کچھ دمِ رخصت
وُہ رو پڑے گی مگر تُم تو حوصلہ رکھنا

عجب نہیں کہ مُسافر پلٹ کے آ جائے
لرزتی پلکوں پہ اک دیپ سا جلا رکھنا

عزیز رکھنا تُم آباد موسموں کو مگر
کھنڈر رُتوں سے بھی تھوڑا سا رابطہ رکھنا

سرشت اُس کی قصیدہ، غزل مزاج مرا
قریب لا کے بھی ہم کو جُدا جُدا رکھنا

دل بضد ہے کہ گنگنائیں تجھے
آنکھ کہتی ہے بھول جائیں تجھے

زخم کھا کر گرے سحر کا پرند
سُرخ مخمل کے پَر جگائیں تجھے

گُل کی حِدّت سے جل بجھا ہے تُو
میرے انگار کیا جلائیں تجھے

غم نہیں ہے اگر تجھے مرغوب
کاش خوشیاں ہی راس آئیں تجھے

تُو ہے آنسُو کی ایک بُوند۔ بتا!
کیوں سمندر گلے لگائیں تجھے

تیری خُوشبو کرے تری تشہیر
کُنجِ دل میں بھی گر چُھپائیں تجھے

اپنی آواز کی سُنیں فریاد
تُو نہ بولے مگر بُلائیں تجھے

یہ بھی کیا قہقہوں کی چلمن سے
میرے آنسُو نظر نہ آئیں تجھے

اِک مُسافر ہے عُمرِ خستہ پا
دن ڈھلے بات یہ بتائیں تجھے

نظمیں

رات بھیگے گی تو ہر تارا چبھن بن جائے گا
رفتہ رفتہ خوں میں ترشب کی قبا ہو جائے گی

شام

شام، تری مہکار عجب ہَے !
دُور افق سے آنے والا
ہر آوارہ حال پرندہ
تیری نازک شاخوں، مخمل پتّوں کی خواہش میں
کتنا ظالم کس درجہ خونخوار ہُوا ہے !
شام، پرندوں کی ڈاروں سے لڑتے لڑتے
تیرا بھی کیا حال ہُوا ہے !

شام اگر تُو دُلہن ہوتی
چمکیلی زربفت کی ساڑھی تجھ پر سجتی
پات، وداع کے گیت سُناتے
اور ہَوا شہنائی بنتی
سارے دُکھ اور سارے سُکھ
باراتی ہوتے
سُورج کے پلّو سے بندھ کر
تُو جانے کس دُور نگر کی جانب جاتی

شبنم ایسے آنسو بوتی
شام، اگر تُو دُلہن ہوتی!

شام، ترا کیا حال ہُوا ہے!
ہر اک تجھ پر جھپٹ رہا ہے
ہر شے تجھ کو نوچ رہی ہے
تارے، اپنے پنجوں سے
اور پنچھی، اپنی چونچوں سے
اور سُورج، اپنے بھالوں سے
اور انساں؟
وہ بے چارہ، اک ازلی بنجارہ
خود تیرا بہروپ بنا ہے
اپنے لہُولہان بدن کو
تیری قبا سے ڈھانپ رہا ہے
تیری طرح، وہ خود بھی تھر تھر کانپ رہا ہے!!

کون اُس کو روک سکتا ہے!

زمیں پر جھاڑیاں
خیمے لگائے
منتظر بیٹھی ہیں
اُس جھونکے کی ـــــ جو اک روز
پُژمردہ پہاڑوں سے اُتر کر آئے گا
خیموں کے پردوں کو
لرزتی انگلیوں سے چھُو کے دیکھے گا
بڑے ہی پیار سے سہلائے گا
اور نیند سے نا آشنا
خیموں کے پردوں کے عقب سے جھانکتی آنکھیں
اُسے حیرت سے دیکھیں گی
پھر اک آنسو بھری نازک سی سرگوشی اُسے
آواز دے گی
اور کہے گی!
آ، خدارا آ
مجھے میرے بدن کے اس جہنم سے رہائی دے

مجھے آزاد کر مجھ سے!

مگر جھونکا کہ اک صحرائی بدّو ہے
کبھی خیموں کی جانب چور قدموں سے نہیں آتا
دہکتی سُرخ آنکھوں
تیز لانبی برچھیوں سے لیس ہو کر
اک سیہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے لپٹا
وُہ آتا ہے ـــــ تو دھرتی کانپ اُٹھتی ہے
پرندے پھڑ پھڑا کر آسماں کی سمت اُڑتے ہیں
دبک جاتے ہیں غرّاتے ہُوئے کُتّے
طنابیں ٹوٹتی ہیں
لفظ مرتے ہیں
ہزاروں ساعتوں میں ـــــ وقت
کٹ کٹ کر بکھرتا ہے
سُموں کی ضرب سے
خیموں کی ساری دھجیّاں
چاروں طرف اُڑ اُڑ کے گرتی ہیں
خزاں میں جس طرح
شاخوں سے پیلے پات گرتے ہیں

چمکتی ریت پر
چاروں طرف خیمے ہی خیمے ہیں
مکینوں سے کہو
پردوں سے مت جھانکیں
کہو پردوں سے لگ کر
یوں کھڑے رہنے کا آخر فائدہ کیا ہے
اُسے آنا ہُوا
تو کون اُس کو روک سکتا ہے ؟

درانتی رقص کرتی ہے!

درانتی رقص کرتی ہے
زمیں پر گنگناتے انگنت خوشوں کے بادل میں
درانتی کوندتی پھرتی ہے

ہر خوشے کا بوسہ لے کے کہتی ہے:
"تمہاری، بس تمہاری منتظر تھی مَیں"
اُسے سینے سے چمٹاتی ہے
جھُولے میں جھُلاتی ہے
اُسے میٹھی سی اک لوری سُناتی ہے!

درانتی رقص کرتی ہے
کبھی گھنگھرو، کبھی مُدرا
کبھی جُھک کر، کبھی اک دائرے میں
گھُوم کر
چاروں طرف سو بار پھرتی ہے

درانتی .

اک ہراساں نسل سے دامن چھُڑا کر

دوسری تک

ایک یُگ کو پار کر کے

دوسرے یُگ تک

درانتی ـــــ خون کی پیاسی

درانتی ـــــ ناچنی !

بھُوری زمیں پر صورتِ تلوار پھرتی ہے

درانتی رقص کرتی ہے !!

ساون کا آخری دن!

ساون! تیری بھیگی پلکیں
جُھکی ہوئی، اچھّی لگتی ہیں
ٹپ ٹپ گرتی نرمل بوندیں
شب بھر، ٹین کی ٹھنڈی چھت پر
نازک سی پوروں سے
ٹائپ کرتی ہوئی، اچھّی لگتی ہیں
گئے دنوں کے نام
معطّر خط لکھتی، اچھی لگتی ہیں
چھت کے نیلے کاغذ کے نیچے مَیں خود بھی
جیسے اِک میلا سا کورا کاغذ ہوں
میرے بدن پر
پوروں کی میٹھی ضربوں سے
لفظوں کے سایے اُترتے ہیں

خط کے سارے شبد مجھے پہچان گئے ہیں

کیا لکھّا ہے ؟
کیا جانوں مَیں کیا لکھّا ہے ؟
کون سی ایسی انہونی سی بات تھی جس نے
برسوں پہلے
"نہ کہنے" کے پلّو سے خود کو باندھا تھا
اور پھر دل کی ڈولی میں مجبوس ہوئی تھی
اتنے لمبے، بوجھل سالوں خود سے بھی وہ چھُپی رہی تھی
آج اُسے کس مجبوری نے
لفظوں کے لب چھُو لینے پر اُکسایا ہے
گئے دنوں کے نام یہ نامہ لکھوایا ہے ؟

ساون کا یہ آخری دن ہے
کل جب بھادوں آجائے گا
ٹین کی چھت پر اپنے اُجلے پَر پھیلاتا
آنے والی سُرخ رُتوں کے
خوابوں میں جب کھو جائے گا
سب آوازیں تھم جائیں گی

پلکیں تھک کر سو جائیں گی
گئے دنوں کا نام
منوں مٹّی کے نیچے دب جائے گا
اگلا ساون کب آئے گا؟؟

مجھے خزاں نے بہت ڈرایا!

خزاں ـــــ دریدہ لباس پیڑوں کے شاخچوں سے
ہزار بدرنگ چیتھڑوں میں گری زمیں پر
بچھی، زمیں پر!
ہزار مجھ سے کہا کہ مَیں بھی
پھٹا پُرانا سا ایک بدرنگ چیتھڑا ہوں
گرا پڑا ہوں
کہا کہ برہم ہَوا کے جاروب لمحہ بھر میں
مجھے بھی ٹھنڈی غلیظ سڑکوں پہ پھینک دیں گے
مہیب، بھاری، کرختے بُوٹوں سے روند دیں گے
ہزار اُس نے مجھے ڈرایا
مگر مجھے ڈر ذرا نہ آیا
کہ مَیں اُدھڑتے، اُداس پیڑوں کے شاخچوں سے
زمیں پہ گرتے / زمین پر خوش بہ خوش اُترتے

کے فرق کو خوب جانتا تھا
تڑختے بے جان خشک پتّوں / ہمکتے بیجوں
کا بُعد بھی مجھ پہ آئینہ تھا
ہَوا کے دُرّوں کے قہر کی بھی خبر تھی مجھ کو
زمیں کے کچّے بدن سے بھی اب مَیں آشنا تھا!!

جزیرے!

سمندر
دودھیا پانی کا اک میٹھا سمندر!
پُرانے سال خوردہ گیت تازہ لَے میں گاتا ہے
ہَواؤں کو جگاتا ہے
قدم آگے بڑھا کر
ریگِ ساحل پر کروڑوں سال پہلے کے نقوشِ پا کو تکتا ہے
ذرا ــــ آگے کو جُھکتا ہے
نقوشِ پا کو گیلے ہاتھ کی مٹھّی میں لے کر
اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے

دمکتے ابر پارے
اُس کے ہونٹوں سے ٹپکتے نرم بوسے ہیں
ہَواؤں کے جواں قاصد جنہیں لے کر بکھرتے ہیں
پہاڑوں، جنگلوں، بے آب صحراؤں میں پھرتے ہیں

اُنہیں آواز دیتے ہیں جو ماں کی گود سے نکلے
مگر اب تک نہیں لوٹے
"یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں
یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں" ——
مگر آواز پر لبیک کوئی بھی نہیں کہتا
ہمیں تو ماں کے خدّ و خال تک بھی یاد کیا ہوں گے
ہمیں تو ماں کے ہونے کی خبر تک بھی نہیں شاید
کہ ہم ہجرت کے دن سے آج تک
اپنے ہی جسموں کی گھنی خوشبو میں لپٹے
خوف کی وادی میں بیٹھے ہیں

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
فلک سے قطرہ قطرہ اوس کی برکھا اُترتی ہے
کبھی جب پیاس کی شدّت سے زخمی ہونٹ
بہتی تیز ندی کے سجل سینے پہ جھکتے ہیں
کبھی جب آنکھ رِستی ہے
تو یوں لگتا ہے جیسے ہم کبھی بچھڑے نہیں اُس سے
کہ جیسے ہم —— جزیرے ہیں

تھپکتے لوریاں دیتے سمندر کے بدن سے ہم
بلکتے، زرد رُو، بیمار بچّوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں
ہماری ہجرتوں کی داستاں جھوٹا فسانہ ہے !!

آزادی!

خموشی
مُنہ پھُلائے
دھپ سے آکر کھاٹ پر لیٹی تو چڑیا
ہنس پڑی، چھت سے
اُتر کر
کھاٹ کے پایے پہ آ بیٹھی
کہا!
بی بی! کسی نے کچھ کہا تجھ سے؟
تجھے بابا نے ڈانٹا؟
ماں نے کوئی سرزنش کی؟
یا ـــــ بڑے بھیّا نے جھڑکا؟
کچھ بتا بھی نا!

خموشی
مُنہ پھُلائے
کھاٹ پر تا دیر گم صُم

جُھولتے، مژگاں کے زینے سے
اُترتے آنسوؤں کو
غور سے تکتی رہی
آخر دوپٹے سے
ڈھلکتے آنسوؤں کو پُونچھ کر

بولی:
تُو چڑیا ہے
تُو آزادی ہے
جب چاہے کُھلی کھڑکی سے، روشندان سے
دیوار کے روزن سے پُھر کر کے
منوّر آسمانوں
سبز کھیتوں، وادیوں
نیلے پہاڑوں، جنگلوں میں گھُوم سکتی ہے
تُو جب چاہے

جہاں چاہے ——
مگر تجھ کو خبر شاید نہیں ہے
مرے چاروں طرف
بے نُور آنکھوں
اَن کہے بولوں کی دیواریں

کھڑی ہیں
مرے چاروں طرف مجھ کو ڈراتی .....

چہک کر ننھی چڑیا نے
خموشی کی لرزتی بات کاٹی
اور پھُدک کر دُوسرے پایے پہ آ بیٹھی
کہا:
بی بی! مرے پَر ہیں
یہ پَر میرے محافظ ہیں
مَیں جاتی ہُوں
مگر واپس بھی آتی ہُوں
حصارِ عافیت سے تُو اگر باہر
کبھی باہر گئی تو کون جانے
کتنی آوازوں کے پنجے
تُجھ پہ جھپٹیں
اور ترے ملبوس کے پُرزے اُڑیں
پھر کون جانے
واپسی کا راستہ تجھ کو ملے
یا نا ملے!

بارش کے بعد!

صُبح چھینٹا پڑا
خُشک دھرتی ہنسی
کھیتیاں دُلہنوں کی طرح گنگنائیں
ہمیں آتے دیکھا تو اتنا لجائیں کہ پتّوں کے گھونگھٹ میں چھُپنے لگیں
سرافراز لہراتے گنّے کے کھیتوں نے
سہروں کی درزوں سے جھانکا ہمیں
اور شکووں کے تیروں سے
چھلنی کیا دیر سے آنے والے سبھی دوستوں کو
براتی — پرندے، ہَوا، بادلوں کے سُبکبار گھوڑے
بزرگوں میں سُورج، درختوں میں برگد، پرندوں میں گِدھ
سب نے مِل جُل کے، آتے زمانوں کی خاطر
ہمارا سواگت کیا
زرد مینڈک، وہ اُجلے مغنّی کہ جن کے گلے
تیز شہنائیاں!

ہر طرف سے
"بُدھائی" ! "بُدھائی" ! کی اُونچی صداؤں میں ہونے لگے نغمہ زن
اور طوطوں کی ڈاریں ہمارے سروں پر سے طیارہ صورت گزرنے لگیں
نرم خوشبُو بھرے شوخ گجروں میں ڈھلنے لگیں

یہ سہروں کی درزوں سے تکتا ہُوا ایک پُورا جہاں
نگاہوں میں آتے زمانوں کا گھونگھٹ اٹھانے کی خواہش نہاں
اُفق کے لہُو رنگ قالین پر
آسماں اور زمیں کا ملن
جیسے ہونٹوں کے ملتے کنارے، کناروں کا خم
یہ مرنے سے پہلے نئی زندگی کا سواگت
خود اپنے بدن کی سیہ راکھ سے
ایک شعلے کی صُورت اُبھرنے کی پیاسی لگن
کیسی خواہش ہے یہ
جس کے صد رنگ مجلس میں ہم۔ بے زباں
بے نشاں ـــ کل بھی تھے
آنے والی رُتوں میں بھی ہوں گے یونہی بے نشاں !!

بیوگی

یہ آنکھیں
جو پھُولوں، شگوفوں، جھروکوں میں بکھری پڑی ہیں
ستاروں کی پلکوں کے پیچھے
کھڑی ہیں!

یہ سیّال سُورج
یہ شبنم کے قطرے
یہ مرمر کے تالاب میں
رقص کرتے ہُوئے سُرخ دَھبّے
سلاخوں کے زنداں میں
جنگل کے فتنے
جواں قمقمے
سال خوردہ دیے
جگمگاتی ہُوئی شاہراہیں

منوّر لبادے

یہ سب
سب کے سب
محض آنکھیں ہیں
ارض و سما میں
چمکتی ہُوئی نُور کی کرچیاں ہیں
جو ہر دم، مسلسل
سیہ لانبی پلکوں کو جھپکے بِنا
دیکھتی جا رہی ہیں
خلاؤں میں اِک تار
بس دیکھتی جا رہی ہیں
اُسے — جو فضاؤں کے اُس پار
تاروں کی دُنیا سے لاکھوں برس دُور کے
اِک جہانِ نہفتہ کا باسی ہُوا ہے
مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے!

کہاں جا چُکا ہے؟
وہاں جس جگہ وقت کے
خستہ پاؤں رُکے ہیں؟

کئی آئینے
ایک ہی آئینے پر جُھکے ہیں ؟
ہیولوں کا
عکسوں کا
اِک خاک ہوتا ہُوا راستہ بن چکے ہیں ؟

کہاں جا چُکا ہے ؟ ؟

تماشہ!

سانجھ سویرے
گلی کی سُوجی آنکھوں میں
مشکیزہ چھینٹے مار گیا!

پھر جھاڑو، گھونگھٹ کاڑھے، چھاگل پہنے
آیا
رُک رُک چلتا
رات کی بکھری، پھٹی پُرانی تصویروں کو
نیلی پیلی تحریروں کو
جیب میں بھر کر
گلی کی گندی خندق کے اُس پار گیا!

پھر دروازے کی اَوٹ سے سائیکل
کھڑ کھڑ کرتا، مونچھیں پُونچھتا

باہر آیا
اور گیا!

پھر اک کالا میلا برقع
ننھّے سے اک نیر بہاتے بسنتے کو
بازو سے پکڑے
گلی کے باہر، کھڑے ہوئے تانگے کی اور گیا!

پھر اک حُقّہ
صدیوں پُرانا باسی حُقّہ
میلا سا اک پھٹا ہوا اخبار اُٹھائے
دُھواں اُگلتا
بُڑ بُڑ کرتا
دھیرے دھیرے تھڑے پر آیا
زور سے کھانسا
ٹھوکر کھائی
سنبھلا
کھاٹ بچھائی، بیٹھا
اور پھر یک دم لیٹ گیا!!

وُہ اِک آبی پرندہ!

مسرّت —— جیسے اِک آبی پرندہ ہے
گلے میں سُرخ اور نیلا رہن
پنجوں میں جھانجھن
اور پَروں پر آسمانی پینگ کی ساتوں لکیریں
ڈُوبتے سُورج کے رنگیں بادباں سے اُڑ کے
کالی رات کے مُردہ سمندر پر اُترتا ہے
سمندر کے سیہ، گونگے لبوں پر
دمکتی مُسکراہٹ کی کرن بن کر جھمکتا ہے
سُنہری شوخ مچھلی کی طرح
اپنے ہی رنگیں دائرے میں
جیسے چھن بھر کے لیے آرام کرتا ہے
معاً اپنے پَروں کو پھڑپھڑا کر تیر کے مانند اُٹھتا ہے
کہاں جاتا ہے؟ —— کوئی کیا بتائے کون سی دُنیا کو جاتا ہے!
مگر میرے بدن پر
اُس کے پنجوں کا نشاں
اِک زخم ہے —— جو دیر تک مجھ کو جلاتا ہے
مجھے —— شاید مجھے جینا سکھاتا ہے!!

سنجوگ

سُرخ گجروں میں نوٹوں کی باسی مہک
مُسکراتے لبوں پر کسیلا دُھواں

ہنستے ساگر سی آنکھوں میں خوابوں کے بجرے، ہمکتے ہُوئے بادباں
دم بدم اُس کی جانب رواں

شام اِک بھاری گھونگھٹ میں گلنار
ماتھے پہ آنسو کی بندی، نگاہوں میں شبنم کی ڈوری

گلی ـــــ قمقموں سے ہراساں
گلی، جس کی دہلیز پہ گھڑ سواروں کا، سوداگروں کا مہکتا ہُوا کارواں

آگ روشن ہُوئی، گرم لفظوں کی نوبت بجی
کچّے دھاگے میں جکڑے گئے اجنبی

اور مُبارک مُبارک کی پھٹتی صدائیں
زمیں سے فلک تک ہُوئیں پرفشاں

اجنبی تھے. بنایا انہیں ہم سفر ـــــ اور فارغ ہُوئے
پھر ـــــ تبسّم کو ہونٹوں سے ہم نے اُتارا، اُسے تہہ کیا جیب میں رکھ لیا

اور پھر چل پڑے، پتّی پتّی ہُوئے، چاروں جانب ہَوا میں بکھرتے گئے
اجنبی ہو گئے !!

صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے![1]

مذاق کرتے ہو؟
ہنس رہے ہو؟
زمیں کو دیتے ہو بیج کہتے ہو لو اُگاؤ
فلک سے کہتے ہو، تم درانتی چلاتے جاؤ!

صدا ہمکتی ہے
جیسے بنجر زمیں پہ
بادل کی چھت سے بوندیں ٹپک پڑی ہوں
فلک سے جیسے کتاب کوئی ہزار کوندوں،
ہزار شیدوں میں ہولے ہولے اُتر رہی ہو!

صدا بکھرتی ہے
جیسے پتّھر پہ آئینہ کوئی گر پڑا ہو!

صدا حُدی خواں ہے

---

[1] اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر

اپنے ناقے کی ہمرہی میں
عقب میں، روتی بسورتی ننھّی مُنّی صداؤں کے بیج بو کر
زمیں پہ اپنی ہی کرچیاں ہر طرف گرا کر
مہیب چُپ کے قدیم صحرا میں
بے جہت، بے مُہار پھرتی ہے
بے جہت، بے مُہار پھرتی رہے گی، اُس کو
کبھی نہ اب تک کسی نے روکا
جو روک لیتا — تو لَوٹ آتی ؟
صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے !!

سانپ پر پاؤں آ جانے کے بعد

ٹپ سے آنسو گرا، چھن
کی آواز آئی
کہا اُس نے: سجدے[۱]!
خدارا اسے تم بجھاؤ نہیں
اب اسے تو بجھاؤ نہیں!
مَیں نے نظریں اُٹھا کر اندھیرے کو گھورا
تو اُس کے سیہ بطن میں بھی رمق جاگتی تھی
رمق — جو کھُلی آنکھ کا مرکزہ تھی
رمق — جس کے محور پہ گہرے اندھیرے کی
لاکھوں سلیں گھومتی تھیں
جس کا ایندھن تھیں، سوکھی ہوئی ہڈیاں، خواہشیں
تتلیاں!
رمق — جو چمکتی ہوئی آنکھ بن کر
مجھے گھورتی تھی!

مجھے گھورتی تھی کہ مَیں

۱؎ ممتاز مفتی کے افسانہ ''آپا'' کا مرکزی کردار

خُشک لکڑی کا کاغذ سے باریک چھلکا
خود اپنے ہی محور پہ چکراتا، مُڑتا
کھُلی آنکھ کے گرم تنوّر میں گر رہا تھا
مَیں گرتا چلا جا رہا تھا!

مَیں گرتا چلا جا رہا تھا کہ ٹھوکر لگی
ٹپ سے آنسو گرا
چھَن کی آواز آئی
رَمق بجھ گئی
مَیں کہ خود کو سدا
خشک ایندھن سمجھتا رہا تھا
مجھے کیا خبر تھی کہ مَیں ایک آنسو کا قطرہ ہوں
گہرے اندھیرے کے مارِ سیہ کی
دہکتی ہُوئی زہر آلود چشمِ فسوں کو بجھانے میں
میرا بھی حصّہ رہا ہے!!

دستک!

یہ دستک سی کیا ہے؟؟
ہر اک لمحہ ـــــ دستک
یہ دن رات اور ماہ و سال اور صدیاں
سبھی دستکیں!
میرے سینے کی دھڑکن بھی دستک
ہَوا ـــــ رات بھر دستکیں دے کے
سوئے ہوؤں کو جگائے
یہ پھیلی ہُوئی ـــــ اپنے اندر بھی، باہر بھی
چاروں طرف بے محابا بکھرتی ہُوئی
چاندنی ـــــ جس کو مٹھّی میں اپنی چھپائے
یہ بھُوری زمیں!
آسماں کے
سیہ بھاری دَر پر مسلسل، پُراسرار
دستک سی دیتی ہُوئی
لاکھوں قرنوں پہ پھیلی ہُوئی
بے ثمر، بے نتیجہ سی دستک کی آواز میں
غرق ہوتی ہوئی!!

مچھ ریکھا

مُٹّھی کھولو
دیکھو ہاتھ کی ریکھاؤں میں کس ریکھا نے دَم توڑا ہے ؟
کس نے رستہ بدل لیا ہے ؟
کس کا رستہ کون سی ریکھا کاٹ گئی ہے ؟
مچھ ریکھا کی بات سناؤ
مچھ ریکھا موجود ہے یا وہ شام کی جھیل کے پار گئی ہے ؟

گہری جھیل تمہاری آنکھیں
ان آنکھوں میں ننّھے مُنّے چڑیوں ایسے خواب آئے تھے
تنکا تنکا جوڑ کے تم نے
جھیل کنارے
کیسے سُندر محل اُسارے
اور پُرانے گھر ڈھائے تھے !

کلر کہار کے گُونگے باغ کے نیلے مور بھی اب غائب ہیں
چڑیوں کی لہراتی ڈاریں

فرشِ زمیں کی اُٹھتی دبتی ہر سلوٹ کو روندگئی ہیں
دودھیا بگلوں کے چھینٹے سے
ہر سُو، کالے کھیتوں کے ٹھہرے پانی پر
آن گرے ہیں
پھلجھری کے داغ بدن پر پھیل گئے ہیں

مُٹھّی کے پَٹ مت کھولو تُم
ریکھائیں چڑیاں ہیں اُڑ جائیں گی ساری
اور تم خالی پیڑ کی صورت رہ جاؤ گے[1] !

---

[1] اپنے ایک عزیز کے اکلوتے بیٹے کی مرگِ ناگہاں پر

پوسٹ مارٹم!

کہاں ہوں ؟
یہ چٹیل زمیں
جس پہ میلوں کے میلے نشاں
جیسے کیلوں کی صورت گڑے ہیں
درختوں کے ہیکل
عمارات کی ہڈیاں
خُشک ندیوں میں
کہنہ چٹانوں کے اعضاء
جلی کھیتیوں کے بدن
اور پرندوں کے جُھلسے ہوئے پَر
کوئی ایک بھی چیز
زندہ نہیں ہے
زمیں مر چکی ہے !

زمیں مر چکی ہے تو کیا ہے ؟
مجھے اُس کے مرنے کا دُکھ کس لیے ہو

اُسے ــ اک نہ اک دن تو مرنا تھا، سو
مر گئی ہے!
مجھے دُکھ اگر ہے تو اس بات کا ہے
کہ جب وہ مری
آسماں نے اُسے
اِک لحد تک نہ دی
(شبنم افشانیاں تو بڑی بات ہے)
آسماں نے فقط یہ کیا
ایک سفّاک سے ڈاکٹر کی طرح
اُس کی اکڑی ہوئی لاش کو
اپنے نشتر سے دو نیم کر کے
بدن کے خزانوں کو باہر نکالا
بکھیرا، ٹٹولا
لکھا: موت ــ صدمے،
کسی ذہنی صدمے سے واقع ہوئی ہے!
پھر اُس نے
زمیں کی کٹی اور پھٹی لاش کو
یُوں ہی رہنے دیا
اور خود چل دیا!

جب سے اب تک
یہ چٹیل زمیں
اک دریدہ بدن بے ردا لاش ہے
اک دریدہ بدن بے ردا لاش ہے!!

طویل نظمیں

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی
اِک ستارا دیر تک رویا کیا

ٹرمینس!

وہاں — کچھ نہیں تھا
بس اِک ننھا مُنّا سا چوکور
لوہے کا کمرہ
جو دفتر، رہائش، ٹکٹ گھر
سبھی کچھ تھا
کمرے کے باہر، نظر کی مُسافت پہ
اِک سُرخ سگنل تھا
اور سُرخ سگنل کے نیچے
سیہ، ریل کی لائنیں
اِک پہاڑی کے سینے سے ٹکرا کے
رُک سی گئی تھیں
ہزاروں برس سے
وہیں — چھنّی کھچّی[1] کے قدموں میں
بے حِس پڑی تھیں!

---

[1] کسی زمانے میں چنیوٹ کے قریب دریائے چناب پر پُل نہیں تھا اور ریل دریا تک جا کر آخری اسٹیشن چھنّی کھچّی پر رُک جاتی تھی۔ بعد ازاں جب پُل بن گیا تو ریل نے دریا کو عبُور کر لیا۔ اور چھنّی کھچّی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

سُنا ہے
یہی بس سنا ہے کہ جب
شام ڈھلتی
ہَوا تیز چلتی
مکاتب میں چھٹّی کا اعلان ہوتا
مدّرس کی دستار
کھونٹی سے نیچے اُترتی
سیہ ناگ بن کر
خزانے پہ کُنڈلی سی اک مار کر بیٹھتی
اور حکمت کا، علم و ہُنر کا خزانہ
چھڑی کے سہارے کھڑا ہو کے
چاندی کے برتن کی صُورت کھنکتا
تو ہم ـــــ زرد بچّے
کسی آنے والے زمانے کے سکّے
لڑھکتے ہوئے، اپنے قصبے کی گلیوں میں چاروں طرف
پھیل جاتے
ہمارے حسیں گھر
تجوری کی صُورت ہمیں
اپنی جانب بلاتے

مگر ہم تجوری کے سکّے نہیں تھے
ہمیں تو زمانے کی گردش میں
خود اپنی قیمت کا اعلان کرنا تھا
اپنی پُراسرار ٹھنڈی چمک میں، ہمیں
لاکھوں پوروں سے مَس ہو کے چلنا تھا
ہم چل رہے تھے!

سو جب رات ڈھلتی
ہَوا تیز چلتی
تو ہم اپنے بابا سے کہتے:
ہمیں بھی کبھی چھنّی کھچّی سٹیشن دکھاؤ
سُنا ہے وہاں اِک پہاڑی نے
پٹڑی پہ دُھونی رَمائی ہے
چوتھی، پُراسرار سی کھونٹ کے دَر پہ
ڈائن بنی، بال کھولے کھڑی ہے
ہمیں ساتھ لے جاؤ، ڈائن دکھاؤ
ہمیں چھنّی کھچّی دکھاؤ!
ہمیں — ہم سے وعدہ کرو
بابا — وعدہ کرو!!

اور بابا ہمیں اپنے سینے سے چمٹا کے کہتے:
وہاں جا کے تم کیا کرو گے
وہاں کیا دھرا ہے
وہاں تو بس اک آہنی سُرخ کمرہ ہے
کمرے سے آگے
جہاں ریل کی لائنیں رُک گئی ہیں
سیہ رنگ کا ایک تختہ ہے
تختے پہ لکھا ہے،
"اب آگے کچھ بھی نہیں ہے"
مرے پیارے بچّو!
نجانے مَیں کب سے
سیہ رنگ تختے کے آگے کھڑا ہوں
مجھے غور سے دیکھ کر فیصلہ تُم کرو
فیصلہ خود کرو!

اور ہم
مُنہ پُھلا کر یہ کہتے:
نہیں، کچھ نہیں جانتے ہم
ہمیں چھُک چھُک ہی دکھاؤ

ہمیں ــــ ہم سے وعدہ کرو
بابا! وعدہ کرو!!

اور پھر ایک دن
اپنے بابا کی اُنگلی سے چمٹے ہوئے
اپنے قصبے سے، گاڑی کے ڈبّے میں داخل ہوئے
اور مسرّت کی اک لہر
جسموں کے اعماق میں ہم نے محسوس کی
دل دھڑکنے لگے
تیز رفتار انجن کی چھک چھک کا حصّہ بنے
ہم کو ایسے لگا جیسے انجن
ہمارا بدن
ریل پر چھائیں ہے
جو ہمارے تعاقب میں
گرتی، سنبھلتی، گھسٹتی چلی آ رہی ہے!

اور پھر یوں ہُوا
ریل کی کھڑکیوں نے ہمیں اپنی جانب بُلایا
ہمیں اِک انوکھا پُراسرار منظر دکھایا

یہ دیکھا کہ ساری زمیں
دھان کی بالیوں میں چھُپی تھی
پرندوں کی ڈاریں
گرسنہ نگاہوں سے دھرتی کو تکتے ہوئے پَر فشاں تھیں
پرندوں کے اُوپر
کسی نرم ریشم کی بدلی کی
بکھری ہوئی دھجیاں تھیں
ذرا اور اُوپر کو دیکھا
تو نیلے فلک کا بدن
بدلیوں کے دریدہ لبادے کی درزوں سے
سب کو نظر آ رہا تھا
معاً "ہم" کے موٹے لبادے میں اک
درز اُبھری
کشادہ ہوئی اور روزن بنی
اور پھر "مَیں" نے
روزن سے باہر نکل کر یہ پوچھا
تجھے کچھ پتا ہے ؟
فلک سے پرے اور کیا ہے ؟؟
تو مَیں نے پلٹ کر

پرندوں کو، بدلی کو، دھرتی کو دیکھا
دھواں دھار انجن کو
انجن کے پلّو سے باندھی گئی ریل کو
ریل میں اپنے بابا کو
بابا کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دوسروں کو
سبھی کو نظر بھر کے دیکھا
تو اُس ایک تابندہ لمحے میں
مَیں
اوس کی اک چمکتی ہوئی بُوند بن کر
زمیں کی پلک پر لرزنے لگا
اپنے "ہونے" کا ادراک کرنے لگا!

اپنے ہونے کا ادراک کرنے لگا
پھر مَیں ڈرنے لگا
چھنّی کھچی کی بُو سُونگھ کر کالے انجن نے
فرطِ مسرّت سے
اِک چیخ ماری تھی
اور اُس کی کالی جٹاؤں نے
پیچھے کی جانب کو اُڑ کر

گھسٹتی ہوئی ریل کے تن بدن کو چھوا تھا
دُھواں ریل کے پیٹ میں بھر گیا تھا
مگر پھر اچانک مجھے میرے بابا نے
پینک سے بیدار ہو کر کہا:
لو سفر کٹ گیا
اب اُٹھو
گاڑی رُکنے کو ہے اپنی چیزیں سنبھالو
زمیں پر اُتر کر، اُسے دیکھ کر
اپنی حسرت نکالو!

مگر مَیں تو پہلے ہی تیار تھا
ریل جیسے ہی، ہچکی سی لے کر رُکی
مَیں نے باہر کی جانب لٹک کر
کسی اندھی، بنجر فضا میں
قدم اپنا رکھا
یونہی، لمحہ بھر کے لیے مَیں فضا میں معلّق رہا
پھر مَیں دھرتی پہ اُترا
دھڑکتے ہوئے وقت کے آخری بُعد میں آ گرا
چھنّی کھچّی کی پھیلی ہُوئی

منجمد قاش پر
برف کی ایک پتّی کی صورت کہیں رُک گیا
مَیں نے دیکھا
مِرے چاروں جانب خلا تھا
مِرا بابا جانے کہاں رہ گیا تھا
نہ انجن نہ گاڑی کے ڈِبّے
دُھواں، آگ، رفتار — کچھ بھی نہیں تھا
وہاں اب فقط ریل کی لائنیں تھیں
جو اِک مُردہ لمحے کی صُورت زمیں پر پڑی تھیں!

مگر مَیں تو اِک مُردہ لمحہ نہیں تھا
مِرے خشک بالوں کے نیچے
مِرے سُوکھے بے آب ہونٹوں سے اُوپر
لرزتی ہوئی چلمنوں والی
دو کھڑکیاں کھُل رہی تھیں
مَیں ان کھڑکیوں سے خلا میں، گھنی دُھند میں
چھنّی کھچّی کے چوکور لوہے کے کمرے کو، سگنل کو
سگنل کے نیچے کھڑی اُس پہاڑی کو جس نے
سبھی ریل کی لائنوں کو معطّل کیا تھا — سبھی کو

اُبھرتے بیولوں کی صورت میں
پہچاننے لگ گیا تھا
مگر پھر معاً میری آنکھوں میں بینائی
کوندے کے انداز میں ایسے آئی
کہ مَیں نے پہاڑی سے آگے
گھنی دُھند کے چاک سے
اُس سجیلے کف آلود دریا کو دیکھا
جو اَن گھڑ سے گھوڑے کے مانند
برہم زقندوں میں مصروف تھا
جس پہ کاٹھی کا
بوجھل سیہ آہنی پُل کا
بارِ گراں تک نہیں تھا!

نجانے مَیں کب تک
زقندوں کے منظر میں کھویا ہُوا
اپنی تارِ نظر میں بندھا
یُوں ہی محصُور رہتا
کہ دریا کے اندر
کسی چکنے پتّھر سے بھیگا ہُوا اِک پرندہ اُڑا

اُڑ کے دریا کے پرلے کنارے کی جانب گیا

اور پھر

میری، حیرت سے پھٹتی چمکتی ہوئی تیز

آنکھوں نے دیکھا

اُدھر، اُس کنارے پہ بھی

سُرخ سگنل تھا

چوکور لوہے کا کمرہ تھا

اور ریل کی لائنیں اُس طرف بھی

کسی مُردہ لمحے کی صُورت زمیں پر پڑی تھیں

کف آلود دریا کی جانب

سیہ ننگی بانہوں کو پھیلائے

بے حِس ہوئی تھیں!

تب اُس ایک بیدار لمحے میں

اِک اور کوندے نے جانے کہاں سے اُتر کر

مجھے گود میں لے لیا اور کہا:

پُل نہ ہو تو

"یہاں" اور "وہاں" میں

زنگ آلود ماضی ہیں اور صاف شفّاف

آنے والے زمانے میں
ٹھہرا ہُوا "اب" کا لمحہ
یہ سگنل، پہاڑی کی دیوار
لوہے کا کمرہ
سدا ایک نقطے پہ قائم رہے گا
زمانے کی پھیلی ہُوئی ڈور میں
چھنّی کھچّی گرہ ہے
گرہ کھُل گئی گر
تو کچھ نہ رہے گا!

مگر آج مَیں سوچتا ہوں
مَیں خود بھی تو اِک ننّھی مُنّی گرہ تھا
مِری ذات میں چھنّی کھچّی چھُپا تھا
مَیں اُس روز لمحے کے پُل کو اگر پار کرتا
تو پھر رُک نہ سکتا
اگر کف اُڑاتا ہُوا تُند دریا
مجھے راستہ دے ہی دیتا
تو مَیں آگے بڑھ کر
خلاؤں میں

ہر آتی جاتی صدا سے
فقط بھیک ہی مانگتا
مَیں — ازل اور ابد کے کناروں میں
بے نام، بے سمت
اَن گھڑ سے گھوڑے کی ٹوٹی رکابوں سے
چمٹا ہُوا
بس بھٹکتا ہی رہتا
بھٹکتا ہی رہتا ! !

الاوّ

سُنا ہے
زمیں ۔ سبز، پیلی، سیہ کروٹوں میں
چُھپاتی رہی ہے تمہیں
اپنے گیلے پَروں کے تلے
گرم خوابوں کی لوری
سُناتی رہی ہے تمہیں
سُرخ سُورج کے بھالوں
جھپٹتے عقابوں
چمک دار جبڑے دکھاتے ہوئے بادلوں سے تمہیں
کتنا محفوظ رکھا ہے اُس نے
تمہیں کتنا آرام اُس نے دیا ہے!

مگر تُم نے دیکھا
یہ چھتنار سا سائباں
سبز مخمل کا بستر
بدن کی حرارت

تمہیں کتنی مہنگی پڑی!
تُم کہ خُود برق کی قاش تھے
ایک دستک تھے، جھنکار تھے
تُم کہ جھونکے کی تُندی،
لہُو کی جوالا سے سرشار تھے
تُم پَروں کے تلے
زرد چُوزوں کی آواز بنتے گئے
اپنی آواز سے تُم بچھڑتے گئے
اور درختوں، مکانوں
گپھاؤں سے
لاکھوں کی تعداد میں سالخوردہ،
گرُسنہ صدائیں
تمہیں دیکھ کر تلملاتی رہیں
ننگے ہونٹوں پہ سُوکھی زباں پھیرتی
تُم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھاتی رہیں
اب تمہیں کیا بتائیں
کہ اُن میں سے ہر اک صدا

جیسے اِک وحشی گُربہ تھی
دانتوں سے، پنجوں سے
ہر زندہ شے پر جھپٹتی تھی
اور دیکھتے دیکھتے
اپنے صیدِ زبوں کی رگوں میں
اُترتی تھی
پھر اُس کے ہونٹوں کی
اُجڑی منڈیروں پہ آ کر
ڈراتی تھی سب کو
یہ آواز جو تُم نے ہونٹوں پہ اپنے
سجائی ہُوئی ہے
تمہاری نہیں ہے
تمہاری صدا، کون جانے، کہاں ہے!
کہاں ہے تمہاری صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو؟؟

اِدھر آؤ
اِک بار پھر مُردہ پیڑوں کے
اعضاء اُٹھائیں، چِتا اِک بنائیں

اِدھر آؤ، اک بار پھر ہم
الاؤ جلائیں
الاؤ کی اُجلی تمازت میں
حلقہ بنائیں
ہَوا برف کی قاش سی بن چکی ہے
ستاروں کے ٹھٹھرے پَروں میں
سکت تک نہیں ہے
سیہ رات ۔ جیسے کہ دیوار ہے
جس میں چاند، ایک ٹوٹا سا دروازہ
کب سے کھُلا ہے

سُنو
اِس کھُلے دَر سے آواز اک آ رہی ہے
وہی لاکھوں برسوں پُرانی صدا
جو تمہاری صدا تھی
تمہیں جانتی تھی!

اِدھر آؤ
پھر سے الاؤ جلائیں
اندھیرے کے ماتھے پہ

اک سُرخ قشقہ بنائیں
دھوئیں کے سندیسوں سے
گزرے زمانوں کو واپس بلائیں
سُنو

پھر سے ہونٹوں میں لرزش ہوئی
اور کہانی کے اعضا سلگنے لگے
ہم نے دیکھا کہ ننگے بدن
سُرخ ہوتے الاؤ کے حلقے میں
سونے کی ڈلیاں بنے
داستاں گو کے ہونٹوں سے مَس ہو کے
سکّوں میں، لفظوں میں
ڈھلنے لگے
اور داستاں گو؟
اندھیرے کے سینے میں روشن ستارا
جو خود بھی سُلگتا ہُوا اِک الاؤ تھا
جس سے اُبھرتی کہانی
ہَواؤں، شگوفوں، پرندوں، گڈریوں
فلک پر چمکتے ستاروں
زمیں پر اُگی گھاس

اور گھاس میں تتلیوں، کالے ناگوں،
درندوں کی اک مشترک داستاں تھی
ابھی روشنی کی سیاہی / سفیدی میں
پانی کی آنسو میں / موتی میں
اور دل کی نفرت / محبّت میں
تقسیم کا وقت آیا نہیں تھا
ابھی آسماں اور زمیں میں
دوئی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا
شگوفوں کے موسم میں جب شب مہکتی
تو بھیگی ہوئی چاندنی میں
محبّت ۔ مکانوں، پرندوں، ستاروں کو
اِک ساتھ چھُوتی
کبھی خاک پر
پریمیوں کی ملاقات ہوتی
تو تاروں کے اُجلے جھروکوں سے
سب دیوتا جھانک کر دیکھتے
آسمانوں سے نیچے اُتر کر
تماشے میں شرکت سے مسرُور ہوتے
تماشہ / تماشائی کا فرق اُبھرا نہیں تھا

ابھی اُن میں کوئی جُدائی نہیں تھی
الاؤ کی میٹھی تمازت میں بیٹھا ہُوا داستاں گو
جو تُم تھے
تمہاری صدا تھی تمہاری صدا
اس صدا پر کسی اور کی حکمرانی نہیں تھی
تمہاری صدا
سارے عالم کی واحد صدا تھی
کہاں تُم نے کھو دی وہ اپنی صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو؟؟

اندر کے رونے کی آواز!

وداع کا وُہ منظر مَیں بھُولا نہیں ہوں
کبھی بھُول سکتا نہیں ہوں
اُسے — جس کے ہونٹوں پہ تھی خود شفق موجزن!
جس کی آنکھوں میں تارے کی اُجلی کرن
آنے والے زمانوں کی تنویر تھی
دُور تک، ہر طرف
ملگجے سے اندھیرے کی زنجیر تھی
رات بھیگی ہوئی تھی

پرندہ
اگر ریل کی دُکھ بھری چیخ سُنتا
تو اک پَل میں گھبرا کے بیدار ہوتا
لرزتی ہوئی شب کی پلکوں سے
آنسُو کی اک بُوند بن کر ٹپکتا

مگر ریل
ندّی میں بہتے ہوئے ایک تنکے کی صورت
بس اِک پَل رُکی
اور پھر چل پڑی تھی
دھواں مُوقلم تھا
بیاضِ فلک پر
پُرانی حکایت نئی طرز میں لکھ رہا تھا
وداع ہوتی شب اپنے اندر کہیں رو رہی تھی !

وداع ہوتی شب لو سدا سے
لبوں کو مقفّل کئے
اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہی ہے
سدا اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہے گی
دُھواں، آسماں کی طرف
اپنے ہاتھوں کو پھیلائے
آنگن کی میٹھی حرارت سے
سُورج کے اُجلے لبادے کو
بوجھل بنائے
چمکتی ہوئی تیز بارش

زمیں پر اُتر کر زمیں کو معطّر کرے
اور تتلی
پَروں کی تمازت
شگوفوں کے چہروں پہ مَل دے
بُجھے راستے، جلتی شمعیں بنیں
اور کھیتوں میں
چاندی کے جھانجھن جھمکنے لگیں
سبز بچّے زمیں سے نئی گھاس بن کر اُگیں
سارے موسم
چہکتا ہُوا ایک موسم بنیں !
رنگ بکھریں
قباؤں پہ، چوغوں پہ، کوری ردائوں پہ نقشے بنائیں
یہ سب کچھ ہو
اِس سے سوا اور بھی اتنا کچھ ہو
کہ سارا جہاں جی اُٹھے
کِھلکھلائے
مگر وہ جو اندر ہی اندر سُلگنے کی، رونے کی
لمبی سزا ہے
بتاؤ

مَیں عُمروں پہ پھیلی ہوئی اس سزا کو
کہاں لے کے جاؤں
کہاں اس کو پھینکوں ؟

سُنا ہے
یہ لمبی سزا —— دائمی ہے
یہاں جو بھی آیا ہے
اُس کے بدن پر
غلامی کا اک نقش ایسا اُبھارا گیا ہے
جسے گنگا جل بھی مٹانے سے قاصر ہے
چاروں طرف سے —— اُسے
اُس کے اپنے ہی سایے نے گھیرا ہُوا ہے
وہ اپنی ہی آواز کی قید میں ہے
ہمہ وقت اپنے ہی خنجر کی زد میں کھڑا ہے
پرندوں، چرندوں، درختوں
زمیں پر سدا رینگنے والے کیڑوں
سبک، مدھ بھری شہد کی مکّھیوں
اور بھونڑوں میں
بس اُس نے ہی خود کو قاتل بنایا ہے اپنا

وہ اپنے لیے
آپ ہی روگ بنتا گیا ہے!

ہَوا سرد ہے
اور وہ خود
جیسے اک سر بہ زانو جہاں گرد ہے
لاکھوں قرنوں کی اندھی مسافت کا
بے کارواں اک مُسافر ہے
پھیلے ہوئے "ہست" کے ایک گوشے میں
سمٹا ہُوا ایک پنچھی ہے
دھرتی — جو اب تک اُسے
گود میں لے کے لوری سُناتی رہی تھی
لرزتی ہوئی اُس کی پلکوں پہ
پَل بھر چمک کر
ابھی ایک موٹے سے آنسو کی صورت
کہیں دُور، اپنے ہی اندر
سُلگتے ہوئے سُرخ لاوے کی ٹھہری ہوئی جھیل میں
جاگری ہے
مجھے اُس کے گرنے کی آواز آئی ہے

آواز مجھ کو، ہمیشہ سے آتی رہی ہے
مَیں اندر کے رونے کی اس بھیگی آواز کو جانتا ہوں
ازل سے مَیں اس بھیگی آواز کو سُن رہا ہوں
اسے خوب پہچانتا ہوں !!